اردو ریسرچ جرنل "تشکیل" جلد:2، شمارہ:2 (جولائی تا دسمبر 2024ء)
ISSN (Online): 3007-3294, ISSN (Print): 3007-3286, HEC Recognized Y-Category Journal

ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی
پروفیسر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ اسلامیہ گریجوایٹ کالج، سول لائنز، لاہور

وجودیت، ماحولیات اور موت کی کتاب

Dr. Aurangzeb Niazi
Professor, Department of Urdu, Govt. Islamia Graduate College, Civil Lines, Lahore

Existentialism, Environmentalism and *Maut ki Kitaab*

ABSTRACT
Khalid Javed is a prominent name in modern Urdu fiction. His work holds unique and distinct significance in Urdu literature. His novel *Maut ki Kitab* was first published in 2011. Although it is a short novel, it is considered a masterpiece due to its theme, language and philosophical depth. According to critics, Khalid Javed presents the existential crisis of contemporary man in this novel. This article presents a study of this novel in the context of Existentialism and Ecological crisis. The writer argues that the extential crisis in Khalid Javed's work is not isolated, it is interwined with environmental crisis and corporate culture.

Keywords: *Novel, Modern fiction, Sartre, Existentialism, Environmentalism, Crisis, Mout ki Kitab, Khalid Javed, Mahooliyat.*

خالد جاوید ہمارے زمانے کے منفرد، غیر معمولی اور اپنی طرز کے واحد فکشن نگار ہیں۔ ان کے ہاں ایک سے زائد ایسے امتیازات کو بہ آسانی نشان زد کیا جا سکتا ہے جو ان کے فکشن کو اپنے معاصر فکشن سے الگ کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے موضوعات، ان کی اپنی جداگانہ زبان، ان کے تخلیق کردہ متن کی پیچیدگی، اس پیچیدگی سے تہ در تہ متباور ہونے والے معانی اور معانی کا تسلسل، ایک مستقل حیرت، نامعلوم کا معلوم ہونا، ناموجود کی موجودگی اور ان کی اینٹی جمالیات جسے پڑھتے ہوئے قاری کو متلی آتی ہے، وہ قے کرنا چاہتا ہے لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر بھی مجبور ہوتا ہے کہ متلی اور قے بھی تو اس کے اپنے وجود کا حصہ ہے۔

"موت کی کتاب" کے دیباچے میں خالد جاوید نے لکھا ہے: "میں جو لکھتا ہوں وہ پتھر پر خراشیں ڈالنے کے برابر ہے، مجھے نہیں معلوم کہ پتھر کو واقعتاً کوئی تکلیف پہنچتی ہے یا نہیں مگر میرے ناخن تو اکھڑ اکھڑ جاتے ہیں۔"(1) پتھر پر خراشیں ڈالنا بذات خود ایک آرٹ ہے اور شاید دنیا کا سب سے مشکل اور قدیم آرٹ بھی۔ خراش یا لکیر بھی ایک متن ہے اور ہر متن کی طرح خراش / لکیر کے بھی اپنے معانی ہیں۔ کاغذ پر لکیر لگانا (لکھنا) بھی آرٹ ہے اور پتھر

پر خراش ڈالنا بھی۔ کاغذ پر کھینچی گئی لکیر اکہری، سیدھی، صاف اور سادہ لیکن پتھر پر ناخنوں سے ڈالی گئی خراش لازمی طور پر کھردری اور ٹیڑھی میڑھی ہوتی ہے۔ خالد جاوید کا فکشن بھی کھردرا اور ٹیڑھا میڑھا ہوتا ہے۔ یہ گہرائی، ٹیڑھا اور کھردراپن ان نادریافت حقیقتوں کو دریافت کرنے؛ اس ناموجود کو موجود میں لانے کی وجہ سے ہے جسے معمول کی دنیا کا مشاہدہ کرنے والا سادہ ذہن آسانی سے قبول نہیں کر سکتا۔ دیکھی ہوئی دنیا کو فکشن کا موضوع بنانا کاغذ پر کھینچی گئی سادہ لکیر کی طرح ہے یعنی روایتی بیانیہ فکشن جو انسان کی حسی، نفسیاتی دنیا اور سامنے کی معاشرتی حقیقتوں کو بیان کرتا ہے۔ جدید فکشن کا مابہ الامتیاز ممکنات کی دنیا دریافت کرنا ہے یعنی پتھر کی بالائی سطح کو کھرچ کر اندر کی نئی دنیا کو دکھانا۔ ایک ماحولیاتی نقاد سکاٹ رسل سینڈرز کا کہنا ہے:

> "ہم دنیا کے ایک حصے یا ایک دائرے کے بارے میں لکھ سکتے ہیں جب کہ اس دائرے سے باہر ایک وسیع کائناتی چکر جاری رہتا ہے۔ ہمارا معاصر فکشن چھوٹے چھوٹے دائرے بناتا ہے جیسے اس کی کم زور سرحدوں سے آگے کچھ اور موجود ہی نہیں۔ یہ ایک چھوٹے سے 'انسانی اخلاقی کھیل' کو کل حقیقت کے طور پر دیکھتا ہے اور غضب ناک انداز میں پھیلے 'بن' کے ادراک کی کوشش نہیں کرتا۔" (2)

خالد جاوید کا فکشن نہ صرف فکشن کے اس پیٹرن کو توڑتا ہے بلکہ اس محدود دائرے سے باہر جھانکنے کی بے باکانہ کوشش بھی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا فکشن ایک محدود "انسانی اخلاقی کھیل" تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کائناتی چکر کو بھی گرفت میں لیتا ہے جس میں انسانی دنیا اور فطرت کی دنیا مسلسل ہم آمیز ہوتے ہیں۔ ان کے فکشن کے بارے میں یہ خیال عام پایا جاتا ہے کہ وہ وجودی فکشن لکھتے ہیں۔ اس فکشن کی مقبولِ عام قرات اس خیال کی تائید کرتی ہے لیکن ہمارے اس موقف کی نہیں کہ ان کا فکشن "انسانی کھیل" کے مقبول اور محدود دائرے کو توڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وجودیت ان کے فکشن کی ایک بالائی پرت ہے، واحد پرت نہیں۔ زیریں سطح پر جس طرح ان کے ہاں خواب اور حقیقت، اشیا اور کردار، مقامات اور جگہیں آپس میں جڑی ہوتی ہیں بعینہٖ معاصر انسان کی وجودی صورت حال، معاصر استعماری بیانیے، کارپوریٹ کلچر، صارفی معیشت اور ماحولیاتی فضا علت و معلول کی بنیاد پر ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں۔ یہ تانا بانا اتنا باریک اور گٹھا ہوا ہوتا ہے کہ اندر کے جوڑ اور گانٹھیں آسانی سے نظر نہیں آتیں۔ فلسفہ وجودیت کا یہ تاریخی تناظر بھی ہمارے پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ بیسویں صدی کے فرد کا باطنی خلفشار، اضطراب اور بے چینی در حقیقت ہولناک جنگوں، تباہ کن ہتھیاروں، فرد دشمن عقائد، روحانیت کے زوال اور عقلیت کے غلبے کا نتیجہ تھا جس کا سبب وہ سائنسی اور صنعتی سماجی انقلاب تھا جس کو مضبوط بنیاد ہیومنزم کے فلسفے نے فراہم کی تھی۔ وجودیت بھی اپنی غایت میں بشر مرکزی فلسفہ ہے۔ یہ انسانی وجود کی انفرادیت اور آزادی پر اصرار

کرتا ہے۔ سارتر کے بقول نباتات اور حیوانات بھی زندہ وجود ہیں لیکن انھیں اپنے ہونے کا شعور نہیں ہے، یہ شعور صرف انسان کو ہے اس لیے وجود رکھنے کا مطلب وجود کا شعور ہے۔[3] تمام انسان پسند فلسفی شعور اور زبان کی بنیاد پر انسان کو دوسری مخلوقات پر فوقیت دیتے ہیں اور دیگر جان دار مخلوقات کے غیر ترقی یافتہ شعور کو محض جبلت کہہ کر اس کی نفی کرتے ہیں جب کہ ماحولیات پسندوں کا دعوا ہے کہ انسان کے علاوہ دیگر موجودات بھی زندہ اور ناطق موضوع ہیں۔ وجودیت اور ماحولیات میں اس بنیادی فرق کے باوجود کچھ اشتراکات بھی ہیں۔ وجودیت "میں" کو مرکزیت دیتی ہے لیکن "ہم" کا واضح انکار نہیں کرتی۔ مارٹن بیوبر اور گبریل مارشل جیسے وجودی مفکرین نے "بین الذاتی رشتوں" کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور دبے لفظوں میں یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ انسان ایک فرد کی حیثیت سے جماعت سے وابستہ ہو کر وجود رکھتا ہے۔[4] فلسفۂ ماحولیات بھی فطرت اور اس کے مظاہر کے انفرادی وجود پر اصرار کرتا ہے لیکن ایک کائناتی وجود پر جس میں انسان اور تمام موجودات آپس میں ہم رشتہ ہیں۔ اس کے نزدیک موجودات کی دنیا میں تمام مظاہر، بہ شمول انسان، ایک قائم بالذات، انفرادی اور جداگانہ وجود کے حامل ہیں۔ فلسفہ ماحولیات فطرت اور ماحول پر استدلال کے غلبے کو مسترد کرتا ہے۔ اسی طرح وجودیت بھی فطرت سے انسان کی بیگانگی اور منطق و عقلیت کے تسلط پر ردعمل کا اظہار کرتی ہے۔ انسان کا وجودی بحران اپنے تاریخی تناظر میں انسان پسندی، عقلیت اور ٹیکنالوجی کے جبر کا حاصل ہے۔ انسان کا یہ تجربہ انسانی وجود تک محدود ہے لیکن اس کے محرکات اور اسباب محض انسان کی باطنی آویزش میں نہیں ہیں، اس باطنی آویزش کے عقب میں مجموعی انسانی صورت حال موجود ہے۔ خالد جاوید کا فکشن وجودیت کے محدود دائرے سے نکل کر انسان کے وجودی بحران کو ایک بڑے تاریخی تناظر میں پیش کرتا ہے جہاں انسانی معاشرت، ارتقا، ثقافت، عقلیت، انسان پسندی، منطق، فطرت سے دوری، صارفی معاشرت اور ٹیکنالوجی کی بے مہار طاقت کے بدیہی اثرات موجود ہیں۔ وجودی مفکرین مصر ہیں کہ جوہر سے پہلے انسان کا وجود مقدم ہے۔ ماحولیات بھی موجودات کے جوہر سے پہلے ان کے وجود کی انفرادیت اور آزادی پر زور دیتی ہے لیکن بدقسمتی سے انسان پسند منطق نے فطرت کے جوہر کو مقدم جانا اور اس جوہر کو اپنی طاقت اور سہولت کے لیے استعمال کیا۔ انسان کا وجودی بحران درحقیقت انسان پسندی کی اس بے لگام طاقت کا تاریخی نتیجہ ہے جس نے انسان اور ماحول کو یکساں طور پر بحران میں مبتلا کیا ہے۔ خالد جاوید کا وجودی فکشن اس یکساں بحران کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ کہنے میں بھی حرج نہیں کہ انھوں نے اپنے فکشن، بطور خاص اپنے ناول "موت کی کتاب" اور "ایک خنجر پانی میں"، میں ماحولیاتی وجودیت کو پیش کیا ہے۔

ناول "موت کی کتاب" پہلی مرتبہ ۲۰۱۱ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس ناول کا مرکزی کردار (متکلم) ایک وجودی بحران کا شکار ہے۔ وہ محبت، نفرت، جنس، گناہ، خوف، جنون، پاگل پن، لایعنیت، دنیا کے خالی پن، بیماری اور

نامردی کے تجربے سے گزرتا ہے۔ خودکشی اس کی ہم زاد ہے اور موت ایک زندہ کردار کی طرح اس کی ہم سفر رہتی ہے۔ وجودیت کا بنیاد گزار ڈینش فلسفی کرکیگارڈ فرد کی شناخت کے لیے اپنی زندگی کو مثال بناتا ہے اور اسے تین ادوار میں تقسیم کرتا ہے۔ پہلا دور جمالیاتی ہے جس میں فرد جبلی تقاضوں اور شہوانی جذبات کی آزادانہ تسکین چاہتا ہے لیکن زندگی کی اہمیت و معنویت سے محروم رہتا ہے۔ دوسرے دور کو اس نے اخلاقی دور کا نام دیا ہے۔ اس مرحلے پر فرد کائنائی ضابطے کو تسلیم کرلیتا ہے۔ وہ ایک عورت کو زندگی کی شریک کے طور پر قبول کرلیتا ہے اور اپنی زندگی میں توازن اور تسلسل لانے کی کوشش کرتا ہے۔ تیسرا مذہبی دور وجود کی شناخت کا مرحلہ ہے۔ اس مرحلے پر مرد یا عورت میں سے کوئی ایک سوچ سکتا ہے کہ وہ دوسرے کی ذمہ داری اُٹھانے کا اہل نہیں ہے۔ اس لیے دوسرے وجود کو دکھ دینے کے بجائے خوداذیت برداشت کرے۔ ضمیر کا بوجھ اور گناہ کا احساس وجودی صورت حال کی کرب ناکی میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بیماری، احساسِ جرم و گناہ، اذیت اور مصیبت سے بھرا ہوا دور ہوتا ہے لیکن یہی روح کی درستی اور صحت کی علامت بھی ہے۔[5] معلوم نہیں خالد جاوید کے سامنے کرکیگارڈ کا یہ ناول تھا یا نہیں لیکن "موت کی کتاب" کا مرکزی کردار کم و بیش انھی مراحل سے گزرتا ہے۔ یہ ناول کا اساسی متن ہے جو بجا طور پر انسان کی وجودی کرب ناکیوں کو سامنے لاتا ہے۔ اس ناول پر اردو میں خاصا لکھا گیا لیکن اردو کے بیشتر اہم لکھنے والوں نے بھی ناول کے مرکزی متن کو ہی موضوعِ مطالعہ بنایا اور مسودے کے مقدمے (جو کہ ناول ہی کا حصہ ہے) اور آخری ورق (جو کہ مکمل خالی ہے) کو حاشیہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی عام کتاب کے پیش لفظ اور حواشی کو اضافی متن سمجھ کر مرکزی متن سے الگ جانا جاتا ہے حالاں کہ مسودے کا یہ مقدمہ اور آخری خالی صفحات ہی تفہیم متن کی کلید ہیں۔

یہ ناول مابعد جدید فکشن کی معروف تکنیک مسودہ تکنیک میں لکھا گیا ہے کہانی کے مطابق دریافت ہونے والے مسودے کو ایک ماہر آثارِ قدیمہ پروفیسر والٹر شلر نے اپنے ماہر لسانیات دوست ژان ہیوگو (جس کا تعلق معروف مستشرق گارساں دتاسی کے خاندان سے ہے) کی مدد سے ترجمہ اور مدون کیا ہے۔ اس مترجمہ متن کا مقدمہ (ناول کا نہیں) پروفیسر والٹر شٹر نے لکھا ہے، یہ کچھ قابل غور نکات سامنے لاتا ہے جو دنیا کے خالی پن اور وجودی بحران کا اصل سبب ہیں :

☆ یہ مسودہ ایسے کھنڈرات سے ملا ہے جہاں دو صدیاں قبل ایک پاگل خانہ تھا۔ تحریر کی لایعنیت، تکرار اور بے تکاپن ظاہر کرتا ہے کہ یہ کسی پاگل کی تحریر ہے۔ اس تحریر کو Dutch Writtings کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے جو نشے کے زیر اثر لکھی جاتی ہے۔

☆ ایک ہائیڈرو الیکٹرک ڈیم کی تعمیر کے لیے اس شہر کو غرق آب کر دیا گیا تھا۔ ماحولیاتی توازن بگڑنے سے اس خطے کی ندیاں سوکھ گئیں اور یہ ڈیم بھی کارآمد نہیں رہا۔

☆ یہ مسودہ جس زبان میں لکھا گیا تھا۔ وہ آج دنیا سے معدوم ہو چکی ہے۔
☆ کتاب کے آخری صفحات خالی ہیں۔ (6)

☆ اور سب سے اہم نکتہ یہ کہ کتاب کے مرتب و مدون نے یہ مقدمہ یکم اپریل ۲۲۱۱ء کو لکھا (یاد رہے کہ ناول ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا)۔ اس سے ظاہر ہوتا کہ یہ کہانی ، ہماری آج کی دنیا اور ہمارے معاصر فرد کی ہے، جو آج سے پورے دو سو سال بعد تک لکھی گئی ہے۔

کتاب کا یہ مقدمہ جس کا مرکزی متن سے تعلق بظاہر برائے نام معلوم ہوتا ہے، بلاوجہ اور بلاجواز نہیں ہے، نہ ہی مقدمہ اور آخر کے خالی صفحات محض مسودے کا تاثر دینے کے لیے ہیں۔ یہ براہ راست متن سے متعلق اور اس کی کلید ہیں۔ مقدمے میں پیش کیے گئے نکات کا تعلق عالمی، سیاسی، ماحولیاتی اور لسانی صورت حال سے ہے جب کہ مرکزی متن انسان کی گھمبیر، پیچیدہ نفسیاتی اور وجودی صورت حال کو بیان کر رہا ہے۔ جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے خالد جاوید کے فکشن میں زبان، ثقافت، معاشرت، نفسیات اور اشیا کے باہمی ربط کی نوعیت بہت پیچیدگی کی حامل ہوتی ہے۔ ماحولیات کا بنیادی اصول ہے کہ "تمام اشیا آپس میں جڑی ہوتی ہیں۔" صرف انسان اور فطری مظاہر ہی نہیں، انسانی ثقافت و معاشرت اور انسانی نفسیات اور ماحول کے مابین بھی ایک گہرا رشتہ ہے۔ اس رشتے کی بالائی سطح کسی سماج کی خارجی ساخت اور معاشرے کی خارجی حقیقتوں کو متاثر کرتی ہے جس کی وجہ سے سماج سے فرد کے تعلق کی نوعیت بھی واضح ہوتی ہے۔ خالد جاوید کا فکشن اس تعلق کی ایک اور داخلی سطح کو سامنے لاتا ہے، یہ انسانی وجود اور ماحولیات کا تعلق ہے۔ ان کا ناول "موت کی کتاب" ماحولیات، وجود، سماج اور عالم گیر صورت حال کے مابین ایک ایک پیچیدہ لیکن لازمی تعلق کو پیش کرتا ہے۔

کتاب کا مقدمہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ جس فرد کی کہانی ہے، اس کا تعلق گرگٹہ ماس نامی ایک چھوٹے شہر سے ہے۔ یہ شہر ایک پاگل خانے، گرگٹوں کی بہتات (اگر یہ ہماری آج کی دنیا کی کہانی ہے تو رنگ بدلنے والی مخلوق کی بہتات میں ہمارے کسان کے عمومی مزاج کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے) اور تل کی فصل کے لیے مشہور تھا۔ مسودہ مجلد شکل میں پاگل خانے کے کھنڈرات میں ایک پتھر کے نیچے دبا ہوا ملا۔ تحریر کی بے ربطی اور لایعنیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی پاگل کی ہی تحریر ہے (کیا ہماری موجودہ دنیا پاگل خانہ ہے ؟)۔ شہر کی غرقابی کسی قدرتی عمل کا نہیں، انسان کے خود ساختہ عمل کا نتیجہ ہے۔ مرکزی حکومت ایک منصوبے کے تحت یہاں ایک ہائیڈرو الیکٹرک ڈیم کی تعمیر کے لیے شہر کو غرقاب کرتی ہے۔ ڈیم تعمیر ہو جاتا ہے لیکن موسمی تبدیلیوں کے تحت ندیاں سوکھ جاتی ہیں اور ڈیم بھی ناکارہ ہو جاتا ہے۔ اس کہانی میں ایک قدیم ترین زمینی مخلوق گرگٹ، پاگل خانے، ڈیم کی تعمیر اور ندیوں کے سوکھ جانے اور شہر کے

کھنڈارت کی زمانی ترتیب میں ایک اور کہانی پوشیدہ ہے: جدید انسان کے پاگل پن کی کہانی، جس نے اپنی عقلیت اور شعور کے زعم میں ٹیکنالوجی کی مدد سے اپنی دنیا کو تباہ کرنے کی طاقت حاصل کرلی ہے۔

ڈیم انسانی ایجاد ہے، ڈیم انسانی ترقی اور توانائی کی ضرورت پورا کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے۔ انسان کو اضافی اور مصنوعی توانائی کی ضرورت اس ٹیکنالوجی کے بے مہار استعمال کے لیے پیش آتی ہے، جس کی دست درازیوں کی تفصیل بہت طویل ہے، مابعد صنعتی عہد کی ساری عمارت ٹیکنالوجی اور توانائی کے اس بے مہابا استعمال پر کھڑی ہے۔ دنیا بھر میں ڈیموں کی تعمیر پر سوالیہ نشان لگ رہا ہے۔ ترقی یافتہ دنیا خود اس سے پیچھا چھڑانے اور توانائی کے متبادل ذرائع ڈھونڈ رہی ہے کیوں کہ ڈیم صرف پانی کے فطری بہاؤ کو ہی نہیں روکتا بلکہ تاریخ اور ثقافت کے فطری بہاؤ میں بھی رکاوٹ ڈالتا ہے۔ پانی کے بہاؤ کو اپنی مرضی سے استعمال میں لانا فطرت کی عمل داری میں صریح مداخلت ہے۔ فطرت کی اقلیم میں انسان کی یہ دست درازی نہ صرف مقامی فلورا اینڈ فانا کو بے دخل کرتی ہے بلکہ مقامی ایکالوجی، ایکو سسٹم اور انسانی ثقافت کو بھی متاثر کرتی ہے۔ شعر و ادب کے استعارے، علامتیں، محاورے، تشبیہیں اور تلازمے جو مقامی ماحولیات سے مستعار ہوتے ہیں؛ رفتہ رفتہ معدوم، متروک اور اجنبی ہو جاتے ہیں۔ زبان میں غیر محسوس تبدیلی کا یہ عمل ایک نئی لسانی ثقافت کو جنم دیتا ہے۔ صنعتی اور مابعد صنعتی عہد میں لسانی تبدیلی کا یہ عمل حالات کے جبر کا نتیجہ تھا۔ مابعد جدید صورت حال میں یہ عالم گیریت کے ثقافتی ایجنڈے کا حصہ ہے۔ ہمارے زیر مطالعہ ناول میں مسودہ جس زبان میں لکھا گیا ہے وہ ۲۲۱۱ء تک معدوم ہو چکی ہے۔ اسے پڑھنے والا کوئی شخص دنیا میں باقی نہیں رہا، کسی لائبریری میں اس زبان کی کوئی کتاب موجود نہیں، نہ ہی انٹرنیٹ پر اس زبان کا کوئی نمونہ موجود ہے۔ "اس کی وجہ سیاسی بھی ہے اور یہ زبان بولنے والوں کی بے حسی اور مادہ پرستی بھی۔"[7] یہ حقیقت اب بہت واضح ہو چکی ہے کہ گلوبلائزیشن کی لسانی استعماریت کے سبب دنیا کی بیشتر زبانوں کا وجود خطرے میں پڑ چکا ہے۔ عالم گیریت سرمایے کی منطق پر کام کرتی ہے۔ اس کا ثقافتی ایجنڈا دنیا بھر میں ایک جیسی زبان، ایک جیسی ثقافت چاہتا ہے جو اس کے سرمایے کے لیے بہت سود مند ثابت ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بیشتر زبانیں اس کی زد پر ہیں اور بعید از امکان نہیں کہ سب زبانیں ختم ہو جائیں اور یہ دنیا یونی پولر ہو جائے۔ ۲۲۱۱ء میں یہ مسودہ ایک ایسی زبان میں ترجمہ کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے جو پوری دنیا کی زبان ہے اور جسے پوری دنیا سمجھ سکتی ہے۔

یکم اپریل ۲۲۱۱ء کی تاریخ کتاب کے مدون و مرتب نے اپنے مقدمے کے اختتام پر لکھی ہے یعنی آج سے قریب دو سو سال آگے کی تاریخ۔ یہ تاریخ کو ایک خاص زمانی فاصلے سے دیکھنا ہے لیکن ماضی بعید کی تاریخ کو دیکھنے سے مختلف ہے۔ گزرے ہوئے وقت کو دیکھنا اور آنے والے وقت کو دیکھنا دو مختلف تجربات ہیں۔ آنے والے وقت کو دیکھنا درحقیقت ممکنات کو دیکھنا ہے۔ جدید ناول کے فن پر بات کرتے ہوئے میلان کنڈیرا نے کافکا کی مثال دی ہے۔ اس

کے نزدیک کافکائی دنیا کسی معلوم حقیقت سے مشابہ نہیں، یہ انسانی دنیا کا امکان ہے۔[8] کنڈیرا انسانی وجودی صورت حال اور انسانی ممکنات کا ذکر کرتا ہے جب کہ خالد جاوید کا فکشن انسان کے ساتھ انسانی دنیا اور فطرتی دنیا کے ممکنات کو بھی پیش کرتا ہے۔ ان کے پیش نظر الگ تھلگ انسانی صورت حال نہیں، ایک مکمل ماحولیاتی وجود ہے اور یہ خوف اور خدشہ بھی کہ یہ دنیا مستقبل میں کیسی ہو سکتی ہے؟

یہاں ایک بار پھر ہم کتاب کے مرکزی متن کی طرف لوٹتے ہیں۔ ہمارا مرکزی کردار نفرت، جنس، شہوت، بیماری، احساسِ گناہ، ندامت اور اذیت کوشی کے اذیت ناک تجربات سے گزرتا ہوا نامردی کے مقام پر پہنچتا ہے۔ اس کے بقول:

> "میں نے اپنے اندر ایک عظیم نامرد کے وجود کو منکشف کیا۔ ایستادہ ۔۔۔ مجھے بے حد چھچھورا، پر تشدد لمحاتی اقتدار رکھنے والا ایک حکمران نظر آنے لگا۔ اس حکمران کو ایک ایسی بصیرت کی ضرورت تھی جس کے بعد اسے ایک بیراگی فقیر بن کر اپنے وجود کے تاریک غار میں چلے جانا چاہیے تھا۔" [9]

نامردی کے احساس کے ساتھ اس پر دنیا کے خالی پن کی حقیقت واضح ہونے لگتی ہے۔ یہ انسان کے پاگل پن، اس کے جسمانی ارتقا کی تکمیل اور ذہنی ارتقا کی آخری منازل کی طرف سفر کا اشارہ بھی ہو سکتا ہے جس کا انجام انسان کی نامردی یعنی تولیدی عمل کا خاتمہ اور بالآخر موجودہ دنیا کا خاتمہ بھی ہو سکتا ہے۔ ناول کے شروع میں شہر کی غرقابی اور زبان کی معدومیت میں اس کا سبب موجود ہے۔ کتاب کے آخری خالی صفحات میں ایک بلیغ اشارہ وجود کی لایعنیت اور دنیا کے خالی پن کی طرف موجود ہے۔ یہ اشارہ معانی کے تسلسل کی طرف بھی ہے۔ معانی کا تسلسل دنیا اور وجود کے نئے معانی کے مترادف بھی ہے اور اس حقیقت کی طرف بھی کہ موجودہ دنیا اور انسان اپنے ارتقا اور ترقی کی بلندیوں کو چھوتا ہوا اپنی موت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ اپنے ماحول کو تباہ کر کے خودکشی کر رہا ہے۔ اس کا احساسِ گناہ اور دیوانگی اپنے ماحول اور فطرت سے دوری اور اس کے استحصال کی وجہ سے ہے۔ وہ مسلسل موت کی طرف بڑھ رہا ہے لیکن خاتمے کی طرف نہیں۔ اس موت کے بعد نئی زندگی کا ظہور ممکن ہے۔ خالی صفحات پر ایک یکسر نیا متن لکھا جا سکتا ہے۔ یہ ڈسٹوپیا سے زیادہ ایکوٹوپیا ہے۔ وجود میں آنے والی نئی دنیا اس دنیا سے بہت زیادہ خوب صورت بھی ہو سکتی ہے اور بد صورت بھی۔

حواشی و حوالہ جات

1۔ خالد جاوید، موت کی کتاب، دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز، 2011ء، ص 9

2. Scott Russel Sanders, Speaking a Word for Nature in Eco-criticism Reader, Ed. Cheryll Glotfelty and Harold Fromm, London: The University of Georgia Press, 1996, P183.

3۔ سارہ، سارتر کے مضامین ، مرتبہ فہیم شناس کاظمی، کراچی: سٹی بک پوائنٹ،2015ء، ص27

4۔احسان اشرف، وجودیت کا فلسفہ، پٹنہ: نیو کوالٹی آفسیٹ،2010ء، ص23

5- قاضی جاوید، وجودیت، لاہور: تخلیقات،1998ء، ص33-34

6۔خالد جاوید، موت کی کتاب، ص 17-18

7۔ایضاء، ص18

8۔میلان کنڈیرا ،ناول کا فن، مترجمہ ارشد وحید، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان،2017ء، ص42

9۔خالد جاوید، موت کی کتاب، ص107

References in Roman Script:

1. Khalid Javed, Maut ki Kitab, Delhi: Arshiya Publications, 2011, P9.
2. Scott Russel Sanders, Speaking a Word for Nature in Eco-criticism Reader, Ed. Cheryll Glotfelty and Harold Fromm, London: The University of Georgia Press, 1996, P183.
3. Sara, Sartre kay Mazameen, Murattiba Faheem Shanas Kazmi, Karachi: City Book Point, 2015, P27.
4. Ehsan Ashraf, Wujudiyat ka Falsafa, Patna: New Quality Offset, 2010, P23.
5. Qazi Javed, Wujudiyat, Lahore: Takhleeqat, 1998, P33, 34.
6. Kahlid Javed, Maut ki Kitab, P17-18.
7. As Above, P18.
8. Milan Kundera, Novel ka Fan, Mutarjama Arshad Waheed, Islamabad: Pakistan Academy of Letters, 2017, P42.
9. Khalid Javed, Maut ki Kitab, P107.